مرزا اطہر بیگ کا غلام باغ: مابعد نو آبادیاتی پڑھت

(Mirza Athar Baig's Ghulam Bagh: A Post-Neo-Colonial Reading)

DOI:https://doi.org/**10.54692/**nooretahqeeq.**2024.08012140**

ڈاکٹر سائرہ ارشاد

Dr. Saira Irshad
Lecturer, Department of Urdu
Govt. Sadiq College Women University, Bahawalpure

نادیہ کنول

Nadia Kanwal
MS Scholar, Department of Urdu
Govt. Sadiq College Women University, Bahawalpure

Abstract:
Mirza Athar Baig is known for his unique style in Urdu fiction. In his novel "Ghulam Bagh" Mirza Athar Baig shows the essence of his best philosophy regarding the treatment of life, consciousness, self identity, characterization, psychological conflict and many other aspects. The philosophy of enlightenment is also present in the novel because enlightenment opposes outdated customs and preferences and considers collective human civilization as the ascension of humanity. Apart from power and domination, the philosophy of human relations is also prominent in the novel. The novel reflects the post-colonial era and the present era; therefore, modern technology and terms are widely used in the novel. Mirza Athar Baig has also experimented with several techniques. Cultural phenomena are central to postcolonialism, so it also studies the differences between colonial and colonized cultures. The novel is written in a post-neo-colonial style, which is different from the traditional style.

Keywords:
Mirza Azhat Baig, Ghulam Bagh, Cultural Phenomena, Philosophy of Consciousness, Psychological Conflict, Colonialism, Post-Neo-Colonial, Enlightenment, Anarchism

مرزا اطہر بیگ عصر حاضر کے جانے پہچانے تخلیق کار ہیں۔ ادب کی دنیا میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

وہ بیک وقت ہمہ جہت ادبی خصوصیات کی حامل ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے افسانہ، ناول اور ڈراما نگاری کے علاوہ بطور مترجم بھی نمایاں مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ ناول "غلام باغ" میں مرزا اطہر بیگ نے فلسفہ حیات، فلسفہ شعور، فلسفہ خودی، کردار نگاری، نفسیاتی کشمکش اور دیگر کئی جہات کے حوالے سے سماجی و تہذیبی مباحث کو چھیڑا ہے۔

مابعد نو آبادیات میں سب سے اہم چیز ثقافت ہے۔ ادب میں ثقافتی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک روایت شکن اصطلاح ہے۔ اس کا دائرہ کار خاصا وسیع ہے۔ مابعد نو آبادیات "نو آبادیات" کے بعد کا دور ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے "نو آبادیات" کے بطن سے جنم لیا۔ ثقافتی مظاہر مابعد نو آبادیات کا مرکز ہیں اس لیے یہ استعماری اور نو آبادیاتی ثقافتوں میں امتیاز کے علاوہ نئی جہات سامنے لاتی ہے۔

مرزا اطہر بیگ کا ناول "غلام باغ" ایک روایت شکن ناول ہے۔ اس میں دوستی، غلبے کا فلسفہ، نفسیاتی عوامل، طاقت کا فلسفہ اور مابعد نو آبادیات کے گہرے اثرات شامل ہیں۔ ناول "غلام باغ" میں جہاں بہت سے فلسفے بیان ہوئے ہیں وہیں دوستی کا فلسفہ سب سے بڑھ کر ہے جس نے رنگ و نسل، دولت اور جنس ہر طرح کے تضادات کو ختم کر کے ناول کی کہانی کو جاودانی عطا کی:

> "So daily life, whatever it may be really is practically composed of two lives, the life in time and the life by values"(۱)

ناول "غلام باغ" میں روشن خیالی کا فلسفہ بھی موجود ہے کیوں کہ روشن خیالی، فرسودہ رسم و رواج اور ترجیحات کی مخالفت کرتی ہے اور اجتماعی انسانی تہذیب کو انسانیت کی معراج سمجھتی ہے۔ اس میں قوت و طاقت اور غلبے کے علاوہ انسانی تعلقات کا فلسفہ بھی نمایاں ہے۔ "غلام باغ" چوں کہ نو آبادیاتی نظام کے بعد کے دور کی عکاسی کرتا ہے اور موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں جدید ٹیکنالوجی اور اصطلاحات کا بکثرت استعمال ملتا ہے:

> "فکشن کا فریضہ یہ ہے کہ انسان اور اس کے گرد و پیش میں پائی جانے والی کائنات کے درمیان جو ربط موجود ہے اس کا ایک زندہ لمحے میں اظہار کرے۔"(۲)

"غلام باغ" ایک ایسا چمن ہے جو آزاد نہیں بلکہ اسیری کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ آزادی اور اسیری دو متضاد اصطلاحات ہیں۔ یہ ایک ایسا چمن ہے جو بظاہر آزاد لیکن غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے نو آبادیات کے بعد سے لیکر عصر حاضر تک کے دور کو پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ناول کا عہد انگریزوں کے نو آبادیاتی نظام سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں موضوعات کسی مخصوص عہدے سے وابستہ نہیں ہیں:

> "غلام باغ بہت وسیع دائرے کا ناول ہے۔ اس میں ماضی کی پرچھائیاں، حال کی بے

ترتیبی اور مستقبل کا الجھاؤ ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔"(۳)

اس کا مرکزی کردار کبیر مہدی خود کو آزاد کہتا ہے۔ مگر وہ آزاد نہیں بلکہ اس کے گلے میں نادیدہ غلامی کا طوق ڈلا گیا ہے۔ یہ آج کے دور کا المیہ ہے موجودہ دور نو آبادیات کے بعد کا ہے جو زیادہ خطرناک ہے کیوں کہ اس وقت ہم انگریزوں کی غلامی میں تھے۔ اس سے رہائی ممکن نہیں۔ ناول "غلام باغ" ارذل نسلوں کی اساطیر سے شروع ہوا اور جب یہ ارذل نسلیں اپنی خودی کی شناخت کے لیے نکلیں تو چلتے چلتے ایک ضخیم ناول کی صورت میں ہمارے سامنے آموجود ہوئیں۔ اس میں نو آبادیات سے لیکر موجودہ زمانہ یعنی مابعد نو آبادیات کے عہد کو دکھایا گیا ہے جس میں مغل شہزادے، شہزادیوں کا رہن سہن تھا، چندر گپت موریہ کا جنم کھنڈر (گم شدہ حقیقت) غلام باغ اس کھنڈر سے جڑا ہوا تھا اسی نسبت سے ناول کا نام "غلام باغ" رکھا گیا ہے۔

"غلام باغ" شہر کے مضافات میں واقع تھا اور آثار قدیمہ کی حیثیت سے شہر کے بیچوں بیچ براجمان تھا۔ شہری آبادی میں وسعت اور اس کے ارد گرد علمی و ادبی و ٹیکنالوجی کے اداروں کی بھرمار سے اس کے وجود کی بقا خاصا پیچیدہ عمل بنتی جارہی تھی، دوسری طرف نوابین اور امرا کی نیت یہ تھی کہ کسی طرح اس سونے کی چڑیا کو اپنی نجی ملکیت میں لایا جائے، وہ اختیارات ہونے کے باعث "غلام باغ" کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا مگر محکمۂ آثار قدیمہ نے اسے قومی ورثہ قرار دے دیا۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ بھی انھی لوگوں میں سے ایک تھا۔ جس نے اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ اس ثقافتی ورثے کو بچانے کے لیے عالمی سطح پر آثار قدیمہ نے مداخلت کی، جس کی بدولت یہ نجی ملکیت میں جانے سے بچ تو گیا تاہم اس کا کچھ حصہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے قبضے میں دے دیا گیا:

> "جس طرح نو آباد کار نے مقامی باشندوں کی روایات، ثقافت، ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے اسے لامرکزیت کا شکار کیا اسی طرح اب نو آبادیاتی ادیب یا نقاد اپنی ثقافت، ادب اور روایات و تاریخ کا مطالعہ کر کے اسے مرکزیت عطا کرے۔ استعمار کار کے ثقافتی غلبہ کو بے نقاب کرے، مقامی رنگ اپنانے میں عوام اس بات کا شعور پیدا کرے کہ وہ فخر محسوس کریں۔"(۴)

سچ تو یہ ہے کہ وہ مدد علی کی بدولت باغ میں کھنڈرات سے ملنے والی نادر اشیا کو قومی خزانے کی تحویل میں دینے کے بجائے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتا رہتا ہے۔ اور اس کا لالچ اس قدر بڑھتا ہے کہ وہ مددِ علی سے تہہ خانوں میں چھپے خزانے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے مگر بارش اور سیلاب کے باعث تہہ خانے سے زندہ واپس نہیں آسکتا۔ موجودہ دور مکمل طور پر یورپی کلچر کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ ہمیں اپنے قومی لباس میں شرمندگی محسوس ہوتی ہے جبکہ یورپی کلچر کو اپنا کر خود کو آزاد خیال سمجھا جاتا ہے، یہی وہ ذہنی غلامی ہے جس کی جڑیں اب بہت مضبوطی سے ہمارے اندر پھیل چکی

ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے جاگیر دار، سرمایہ دار، امرا اور اب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ مغربی کلچر کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں:

"تم یہاں کے رؤساء یہاں کے نودولتیوں یہاں کے بڑے بڑے جاگیر داروں حتیٰ کہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے نام نہاد علمبر داروں کی کوٹھیاں ان کے عالیشان بنگلے دیکھ لو، تمھیں وہاں ایک بھی مقامی درخت نہیں ملے گا، ان میں سے کوئی بھی کیکر، نیم شیریں اور شیشم کو اپنے لانوں میں اگانا پسند نہیں کرتے۔ یہ کچھ درختوں کے نام ہیں۔ یہ سب نہیں ملیں گے، سڑکوں کے کنارے ادھر، ادھر اکا، دکا بس اپنے زور پر آگے ہوئے، تم گوروں نے تو ہم سے ہماری نباتات بھی چھین لی۔"(۵)

عصر حاضر میں جب ہر شے ترقی کر چکی ہے۔ جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ دنیا چاند سے بھی آگے جانے لگن میں ہے اور سیارہ مریخ پر زندگی کے آثار تلاش کرنے کے لیے تحقیق کی جا رہی ہے۔ وہیں ہمارے معاشرے میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمارے سماج کے سب سے معتبر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بظاہر پڑھے لکھے ہیں مگر ان کی سوچ ابھی بھی پہلے زمانے کے لوگوں جیسی ہے۔ قدیم ارذل نسلوں کی اساطیر جاننے کا خیال نو آبادیاتی دور میں والبرج کلب میں بیٹھے ہوئے چھے دوستوں آیا جنھوں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہندوستان میں کچھ ایسی قومیں بستی ہیں جو سورج کو دیوتا مان کر ان کی پوجا کرتی ہیں یہ انتہائی کم ذات قبیح قسم کے لوگ ہیں۔ یہ انسانیت سوز رویہ ہے، سورج چاند کی پوجا تو قدیم رومن اور یونانی بھی کرتے رہے ہیں لیکن یہ تو اعلیٰ النسل لوگ ہیں۔

اُم ان گار قبیلے کے قبیلہ کاؤچل اور پاؤگل (کاؤچل کاچھر) یاؤگل (پگل) کے ذریعے سوکڑ نہر کے کنارے بسنے والی مانگر جات قوم آباد تھی۔ ان دنوں اس نہر کی کھدائی کا کام ہو رہا تھا۔ اس نہر کے کنارے رہنے والے مانگر جاتی لوگوں کو ارذل قوم کہا جاتا تھا اور اسی مانگر جاتی کی اساطیر جانی جا رہی تھی ان کے لیے بھی نسلی گراف ترتیب دیا جا رہا تھا۔ مرزا اطہر بیگ نے ناول "غلام باغ" میں اپنی مانگر جاتیوں کو موجودہ عصر میں بھی دکھایا ہے کہ انگریز سرکار کے بعد مانگر جاتی کا ایک ڈاکیا جو ایک ماسٹر کی ہمدردی کے باعث آٹھ جماعتیں پڑھ کر ڈاکیا لگ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مانگر جاتی کے کسی فرد نے اپنی علیحدہ شناخت بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا کیوں کہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا یاور پڑھ لکھ کر شہر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ خادم حسین ڈاکیے سے پہلے کچھ افراد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر ان کا انجام کاچھڑوں اور پگلوں نے اتنا بُرا کیا کہ کتے کو بھی لوگ آسان موت مارتے ہوں گے مگر مانگر جاتی کے لوگوں کی وقعت تو کتوں سے بھی کمتر تھی۔ چناں چہ انھیں اتنی اذیت ناک موت مارا جاتا کہ آئندہ بھی کسی میں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ کاچھڑوں اور پگلوں کی برابری کا سوچتے۔

جب مانگر جاتی عورتیں امرا کے گھروں میں کام کرتیں اور کاچھڑوں، پگلوں کے کسی مرد کا دل کرتا تو ان عورتوں سے اپنے بستروں کو گرمانے کا کام بھی لیتے۔ اپنی ہوس کی تسکین کے وقت مانگر جاتی عورتیں کم ذات نہ رہتیں۔۔ اس پر ہی اکتفانہ تھا بلکہ یہ ظالم کاچھڑا اور دیگر سر عام بھی مانگر عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے:

"بھاگاں وہ جوان عورت جو مانگر جو میں کھلی پھرتی تھی۔۔۔مانگر بلی جو سیہہ، گوہ، کلرے اور سانپ کا گوشت کھالیتے تھے۔۔۔ اس نے خود دیکھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا۔۔۔ جھیڈو مانگر بلی کا گوشت کھارہا تھا اور بھاگاں کو بھی کھلا رہا تھا اور افضل کاچھر اور سراج پگل نے انھیں پکڑ لیا۔"(۶)

مرزا اطہر بیگ نے کاچھروں اور پگلوں کی ہوس کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے اس ناول میں مانگر جاتی نسل کو جس طرح ظلم کا شکار ہوتے دکھایا گیا ہے، یہ ہمارے موجودہ دور کا بھی المیہ ہے۔ دولت مند طبقہ اپنی ہوس کو اپنے اختیارات اور طاقت کے بل بوتے پر حرام کو بھی حلال ناجائز کو بھی اپنے لیے جائز منوالیتا ہے۔ غریب انسان اپنا استحصال ہوتے ہر پل دیکھتا ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے مگر لب پر فریاد نام کی کوئی چیز نہیں لاتا۔ ظلم و ستم کے باوجود ان کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ غریب اپنے وجود کو اس قدر حقیر تصور کرتا ہے کہ اپنی حیثیت کو خود ہی ان کی جوتیوں کے برابر قرار دیتا ہے۔

یاور کا باپ خادم حسین تعلیم یافتہ ہوتا ہے جب خادم حسین کی بیوی پُروائی بھی کاچھڑوں پگلوں کی ہوس کا نشانہ بنی ہے۔ تو وہ اپنے کنبے کو لیکر مانگر جو سے دور محلہ پکھیاں (انعام گڑھ کے ایک محلے پکھیاں) میں رہائش اختیار کرلیتا ہے۔ اس طرح ارذل نسلوں میں بھی ترقی ہونا شروع ہوئی۔ مرزا اطہر بیگ نے ناول "غلام باغ" میں جو سب سے وہ انسان کی اپنی "بقا کا فلسفہ" پیش کیا ہے۔ ناول میں مردوں کی ہوس پرستی کو کھل کر بیان کیا گیا ہے انھوں نے بھی ناول میں خیر و شر کو اہمیت نہیں دی بلکہ ہمارے حقائق کو بڑی بے دردی سے بے نقاب کیا ہے۔ ناول میں خصی کلب بھی یاور عطائی کے گھر میں بنایا گیا ایک ایسا دواخانہ ہے جہاں پر ملک کے مایہ ناز نواب، سیاستدان، اخباروں کے مدیر، تاجر اور سمگلرز وغیرہ جیسی شخصیات مستقل بنیادوں پر شرکت کرتے ہیں مگر پس پردہ ان کی ہوس پرستی ہے جو انہیں کلب کا رکن بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ سب اپنی جنسی بھوک کو مٹانے اور مردانہ کمزوری کو چھپانے کے لیے یاور عطائی کی تیار کردہ دوا "گنجینہ نشاط" کے محتاج ہیں۔

یاور عطائی مانگر جاتی قوم کا نمائندہ ہے۔ اس کے دل میں اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے اپنے استحصال کے بدلے کا جذبہ موجزن ہے۔ اسی جذبے کے پیش نظر وہ اپنے صدیوں پر محیط استحصال کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ "گنجینہ نشاط" سے وہ اپنی

نفرت کو کھل کر نکالتا ہے اور اس دوا کو شہر کے بڑے بڑے رؤسا میں فروخت کرتا ہے، اس طرح انھیں جنسی تسکین کی ادویات کا عادی بنا کر ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ ادویات بہت منفرد کارکردگی کی حامل ہیں جو کہ بازاروں میں کہیں بھی دستیاب نہیں۔ مانگر جو سے تعلق رکھنے والے اس مانگر جاتی نے اعلیٰ سطح کے لوگوں کو اس طرح اپنے قابو میں کرر کھا ہے کہ اگر اس دوا کے حصول کے لیے یاور عطائی انہیں کہے کہ میرے پیروں کے تلوے چاٹو تو وہ تلوے چاٹنے پر بھی تیار ہو جائیں، اس ضمن میں ڈاکٹر محمد یٰسین لکھتے ہیں

"معاشرے کے اندر افراد کے تعلقات کا تعین زندگی کی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔"(۷)

مرزا اطہر بیگ نے ناول میں بہت سی اصطلاحات متعارف کروائی ہیں۔ ان میں ایک اصطلاح خصی کلب کی بھی ہے۔ "خصی کلب" اپنے لحاظ سے ایک بے حد وسیع اصطلاح ہے کیوں کہ اس میں ہمارے سماج کے تقریباً تمام سماجی، سیاسی، غیر سیاسی، مذہبی اور روحانی ادارے چلانے والے لوگ شامل ہیں۔ ناول میں مرزا اطہر بیگ نے مابعد نو آبادیاتی صورت حال بیان کی ہے کہ آج کے دور میں بھی جدید میڈیسن اور طبی ماہرین کے ہوتے ہوئے معاشرے کا سب سے معتبر اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ یاور عطائی جیسے نیم حکیموں کے چکروں میں پڑا ہوا ہے۔

"غلام باغ" میں مرزا اطہر بیگ نے صرف سوکڑ نہر کے گرد آباد مانگر جاتی لوگوں اور ارذل نسلوں کے تعلق کو بیان نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے کہ ہمارے ملک میں بسنے والا ہر وہ شخص ارذل نسلوں سے تعلق رکھتا ہے جو غریب ہے اور معاشرے میں اس کی حیثیت کیڑے مکوڑے جیسی ہے، جسے کوئی طاقتور اپنی طاقت کے نشے میں پیروں تلے روند کر چلا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی دور میں ملک پر غیروں کا راج تھا۔ ان کے مظالم سہتے وقت لوگوں کے دل سے فریاد اٹھتی تھی کہ ان سے نجات کا ایک وقت آئے گا اور ہم آزادانہ طور پر بلاخوف و خطر زندگی بسر کر سکیں گے۔ انگریز بر صغیر کو دولخت کر کے اپنے دیس کو سدھار گئے، آزادی کا خواب دیکھنے والی آنکھوں کو آزادی کی تعبیر بھیانک روپ میں ملی۔ ارذل نسلوں کے وجود کو زمین پر ایک ایسے تالاب کی مانند سمجھا جانے لگا جس کا اندر غلاظت گندگی کا مرقع ہو۔ ان کی حیثیت کتوں بلوں سے بھی زیادہ گری ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے سائیں، جاگیر داروں وڈیروں کے تابع تھے۔ یہ ہمارے سماج کی تلخ ترین حقیقت ہے کہ کبھی غریب کو اوپر آنے نہیں دیا جاتا۔ در حقیقت غریب ہمیشہ غریب ہی رہتا ہے۔ اس کے برعکس امیر کی دولت، جمع کی بجائے ہمیشہ ضرب ہوتی ہے:

"اجارہ داری کسی نظریئے، تصور اور اقدار کا ایک ایسا غلبہ ہے، جس میں تشدد ہو، استعماریت، طاقت کے متشددانہ اور بہیمانہ استعمال میں کوئی قباحت نہیں دیکھتی مگر وہاں جہاں فوری سیاسی اور عسکری اہداف کا تعاقب مقصود ہو۔"(۸)

"غلام باغ" میں نفرت و انتقام کے فلسفے کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ یہ نفرت، حقارت، انتقامی، کاروائی سب ہی

ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ پوسٹ کلونیل دور کا معاشرہ جس نے اپنا اوڑھنا بچھونا صرف زر و زن کو بنالیا ہے مگر افسوس تو اس بات پر ہے کہ دولت کے آجانے سے وہ انسانیت کی پہچان کھو بیٹھا، اپنے سے کمتر لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنے لگا۔ اس میں مرزا اطہر بیگ نے لوگوں کی نفسیاتی کیفیات اور ذہنی کشمکش کو بھی بیان کیا ہے کہ انگریزوں کے جانے کے باوجود ہم لوگ آج بھی کسی نہ کسی لحاظ سے ذہنی طور پر ان سے متاثر ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہیں حیلے بہانوں سے اس احساس کمتری کو دور کرنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ اس کی واضح مثالیں یاور عطائی اور کبیر مہدی کے کردار کی شکل میں موجود ہیں کیوں کہ ان میں انتقامی جذبہ اور آقا بننے کی خواہش ہمیشہ پوری طرح جلوہ گر رہتی ہے۔ ناول "غلام باغ" میں مابعد نوآبادیاتی سوچ اور مابعد نوآبادیاتی اثرات کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

کبیر مہدی اس ناول کا ہیرو ہے۔ وہ ایک ادیب و فری لانسر ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہے۔ کبیر مہدی بہت زیادہ ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئے خیالات کا مالک ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور کوہستان نمک کے گاؤں سنمیال کا رہنے والا ہے:

> "کبیر مہدی ایک نامراد ادیب ہو سکتا تھا بلکہ شائد وہ سرے سے کوئی ادیب ہی نہ تھا۔ کیوں کہ وہ کوئی ادب تخلیق نہیں کر سکا تھا۔ لیکن وہ صفت جو کسی بھی ادب ساز کا قیمتی سرمایہ ہو سکتی ہے وہ اس میں شائد کامیاب ادیبوں سے بڑھ کر موجود تھی۔ اس کی طاقتور متخیلہ جو کہ حسیاتی مناظر کو اتنی کامیابی سے چشم تصور کے روبرو مجسم کر دیتی تھی کہ کبھی کبھی تو اس کا شعور حقیقت اور محض تصور میں امتیاز کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔"(۹)

کبیر مہدی ایسا بے باک کردار ہے جس کے ذریعے سے مرزا اطہر بیگ نے سماج کی نراجیت اور منافقانہ چہروں کی نقاب کشائی کی ہے جس کا مقصد سراسر ذاتی مفاد کے حصول کے سوا کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے ہماری ملکی معیشت اور سیاست زہر آلودہ ہو چکی ہے۔ کبیر مہدی کی آڑ میں پاکستانی لوگوں کے اصل چہروں کو سامنے لائے ہیں جو ملکی سالمیت اور دائمی بقا کے دعوے کرتے نہیں تھکتے۔ ان کا ذاتی مفاد پورا ہوا وہیں سارے کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مرزا اطہر بیگ نے کبیر کے نیلے رجسٹر میں درج یادداشتوں کے ذریعے سوچ کا کھل کر اظہار کیا ہے:

> "آج جب میں نے انھیں بتایا کہ میں نے اپنا اصل نام یعنی کبیر مہدی ترک کر کے ایک نیا نام اختیار کیا ہے مگر جسے میں صرف اپنی ادبی افسانوی تحریروں میں استعمال کروں گا۔۔۔ اس پر زہرہ متجسس ہوئی اور کہنے لگی۔ نام کیا ہے؟ گیگلا گیگلا۔۔۔ زہرہ نے کہا کیا مزے کا نام ہے۔"(۱۰)

اسی طرح کبیر مہدی "لالکھائی" اس کا مطلب ہے "کچھ نہ لکھنا" یہ بھی ایک بالکل نئی اصطلاح ہے۔ جو مصنف نے متعارف کرائی ہے:

> "لالکھائی یعنی وہ لکھائی جسے میں تحریر ہی نہیں مانتا اور نہ ہی اس کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار ہوں۔ یہ لفظ آج تک میں نے کسی کے سامنے استعمال نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا۔"(۱۱)

مابعد نو آبادیاتی دور میں "روشن خیالی" ایک اہم عنصر ہے کیوں کہ روشن خیالی انسان کو روایتی زنجیروں سے آزاد کر کے قدامت پسندی سے دور لے جاتی ہے اور انسان اپنے لیے خود نئی راہیں استوار کرلیتا ہے جس میں وہ سماج کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنے مطابق زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے۔ زہرہ بھی روشن خیالات کی مالک ہے جو ایک ہی وقت میں تین مردوں کے ساتھ دوستی قائم کیے ہوئے ہے۔ زہرہ کی حیثیت مانگر جاتی قوم میں دیکھیں تو وہ ایک ایسی شہزادی ہے جو کہ مانگر جات کی اساطیر سے نکلی ہے اور اس میں ارذل قوم سے تعلق کی بنا پر نفسیاتی طور پر وحشت بھی وراثت میں ملی ہے۔ جو اس کی ذات کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اوپر کسی کو غلبہ حاصل نہیں کرنے دیتی۔ وہ شہر میں پلی بڑھی تھی اور اس کی تربیت اعلیٰ گھرانے میں اعلیٰ ماحول میں ہوئی، جس نے اس کو دوسری لڑکیوں کی نسبت انفرادیت عطا کی ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے زہرہ کی صورت میں ہمارے آج کے معاشرے کی عورت کی تصویر کشی کی ہے۔ زہرہ ناصر سے تو پہلے ہی واقف تھی مگر ہاف مین اور کبیر مہدی سے اس رات ملتی ہے جب یاور عطائی کے ڈرائنگ روم (خصی کلب) میں خصی کلب کے ممبران کی پارٹی چل رہی ہوتی ہے اور یہ دونوں بطور مہمان وہاں جاتے ہیں۔ امبر جان کے حملے کے نتیجے میں کبیر اسے امبر جان کی گرفت سے نکالتا ہے۔

جرمن آرکیالوجسٹ ہاف مین نے زہرہ کی تعریف اس کے حسن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دنیا بھر کی مشہور ملکاؤں کے مدمقابل کھڑا کیا۔ یہ داد تحسین کا انوکھا انداز ہے کہ وہ شخص جس کے اپنے ملک میں حسن اور حسین چہروں کی کمی نہیں مگر وہ ایک پاکستانی حسینہ کی زلفوں کا اسیر ہو بیٹھا۔ انگریز جو ہمیشہ سے اپنے آپ کو اعلیٰ و برتر اور دنیا پر حکمرانی کرنے والے دنیا کو اپنے اشاروں پر چلانے والے سمجھتے ہیں مگر یہاں پر ایک انگریز شخص نے اپنے نسلی تفاخر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک پسماندہ ملک کی حسینہ کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرلی۔

ہاف مین غلام باغ کے سلسلے میں معلومات لینے کے لیے نواب نادر ثریا جنگ کے ساتھ جنم کھنڈر میں جاتا ہے۔ یہ اس کی اپنے کام کے ساتھ سچی لگن ہے کہ، اتنی طوفانی بارش میں سیلاب کی صورت اختیار کرتا، وہ بلاخوف وخطر جاتا ہے کہ یہ جان سکے واقعی مدد علی نے سونے کے سکوں سے بھرا صندوق جو دیکھا تھا وہ اسے ملتا ہے کہ نہیں مگر جنم کھنڈر کے تہہ خانے کی زمین دھنس جانے سے وہ بھی دھنس جاتے ہیں:

"زمین جنبش کرتی ہے اور ہاف مین ایک ہی وحشت انگیز لمحے میں جان لیتا ہے کہ دھنس رہی ہے عظیم جنم کھنڈر کا وہ ہیبت ناک تہ خانہ اپنے جنم کی اصل زمین کی کوکھ میں دھنس رہا ہے۔ ہاف مین دیکھتا ہے کہ زمینوں کے تنگ دروازے اور تہہ خانے کے فرش میں گہرا شگاف کھلتا جارہا ہے پھر بھول بھلیاں زینے کو گہرائی سے اونچائی تک مات دیتا اوپر جنم کھنڈر کے کسی کونے میں جا نکلے گا۔۔۔ آگے لازوال رات ہے۔"(۱۲)

گرٹریوڈ مقامی لوگوں سے شدید نفرت کرتی ہے اور حقارت سے دیکھتی ہے۔ یہ ایک مغرور مزاج کی لڑکی ہے جس میں اب بھی نسلی تفاخر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ فریڈرک ہاف مین کو تعجب سے دیکھتی ہے کہ اس کا مقامی لوگوں سے کس قدر میل ملاپ ہے:

"ویسے فریڈی تم مقامیوں سے اچھی خاصی دوستی بنا لیتے ہو۔۔۔ میرے لیے ناممکن ہے۔ اف میرے خدا یہاں کے کسی مرد سے بات کرنا بھی دشوار ہے کتنی شدید جنسی بھوک ان کی آنکھوں سے ٹپکنے لگتی ہے۔"(۱۳)

گرٹریوڈ آسٹریلین لڑکی فریڈرک ہاف مین کی دوست ہے۔ زہرہ کو دیکھے بنا اس سے حسد کرتی ہے۔ یہاں مرزا اطہر بیگ نے ایک عورت کی نفسیات بیان کی ہے کہ عورت چاہیے مشرق سے تعلق رکھتی ہو یا مغرب سے یہ بات اہم نہیں بلکہ اہم تو یہ ہے کہ وہ اپنے اور محبوب کے درمیان کسی دوسری عورت کا وجود برداشت نہیں کرتی۔ گرٹریوڈ ناصر ہاف مین کے ساتھ زہرہ کو دیکھتی ہے کیوں کہ وہ تینوں بھی غلام باغ میں وہی مقام دیکھنے آئے ہیں جہاں ہاف مین کی موت ہوئی تھی ۔ گرٹریوڈ انہیں پہچان لیتی ہے کہ یہ ہاف مین کے مقامی دوست اور یہ عورت جو غیر معمولی حد تک حسین ہے وہی ہے جس نے ہاف مین کو اس سے دور کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس اس گہرائی کے اوپر کھڑے ہو کر ہاف مین کی روح کو مخاطب کر کے چیخ کر کہتی ہے:

"میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ ہاف مین میں نے اس کتیا کو جس نے تمھیں نامرد بنا دیا تھا۔
اس کی آواز اندھے کنوئیں میں گونجتی ہے۔"(۱۴)

مصنف نے اس کے اندر زہرہ کے خلاف بھری نفرت و اضطراب کو اس چیخ کے ذریعے سے اُجاگر کیا ہے مہذب تہذیب سے وابستہ لڑکی گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ نواب ثریا نادر جنگ کا کردار مرزا اطہر بیگ نے ہمارے سماج میں موجود بے ضمیر لوگوں پر گہرے طنز کے طور پر پیش کیا ہے کہ اپنی جاگیر کے ہوتے ہوئے بھی نواب نے "غلام باغ" کو اپنی ملکیت میں لانے کے لیے عدالت میں کیس کر رکھا ہے مگر غلام باغ سے ملنے والی قیمتی اشیا پر وہ اپنا پورا حق جتاتا تھا۔

نواب صاحبِ حیثیت ہونے کے باوجود "غلام باغ" پر ناجائز قبضے کے خواہاں تھے اور اس کے کھنڈروں کو اپنی تحویل میں رکھ لیتے تھے۔ ایسے لوگ جو اپنی خود غرضی کے آگے کچھ نہیں دیکھتے یہی لوگ معاشرے کی پیشانی پر ایک بد نما کلنک ہیں۔ امداد علی بظاہر گھوڑوں کی خوراک کا مصالحہ بنایا کرتا تھا مگر وہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ جنم کھنڈر کے متعلق یہ خواب دیکھتا ہے کہ سیڑھیاں اتر کر کہیں تہہ خانہ ہے اس میں سونے کے سکوں سے بھرا ہوا صندوق موجود ہے بس اسی وجہ سے نواب ثریا جاہ نادر جنگ نے اس کے ذمہ خزانے کو ڈھونڈنے کا کام لگا رکھا ہے۔ یہ غلام باغ کے کھنڈرات سے نکلنے والی نادر و نایاب اشیا نواب کو دیتا تھا ایک بالکل وفادار ملازم کی مانند نواب اسے اتنے پیسے دے دیتا جتنا کہ اس کا بھائی عاشق علی ایک مہینے میں بھی نہ کما سکتا تھا، اچانک مدد علی کو چپ لگ جاتی ہے۔ عاشق علی ڈاکٹر ناصر، ہاف مین اور کبیر مہدی اسے ہسپتال لے کر جانے کا کہتے ہے مگر وہ کسی صورت منہ نہیں کھولتا۔ ہسپتال میں اسے بے ہوشی کا انجیکشن لگا کر جب منہ کھولا جاتا ہے:

> "اس نے تیزی سے جراحی کا ایک آلہ نکالا اور اسے اتنی احتیاط سے مدد علی کے منہ میں داخل کرنے لگا۔۔۔ چمبٹی نما آلہ منہ سے نکلا تو اس کی چونچ میں ایک سکہ دبا ہوا تھا ۔۔۔ او میرے خدا۔۔ یہ تو ملکہ وکٹوریہ کے عہد کا برطانوی دور کا سکہ ہے۔۔۔ خالص سونے کا برٹش گنی۔"(۱۵)

مرزا اطہر بیگ نے مدد علی کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ملازم اپنے آقا کے ہمیشہ وفادار رہتے ہیں، وہ قیمتی چیزوں پر بھی صرف اپنے آقا کا ہی حق سمجھتے ہیں حالانکہ مدد علی چاہتا تو وہ ان کو بازار میں فروخت کر کے اچھی خاصی رقم حاصل کر سکتا تھا مگر اس نے اپنے ایمان کا سودا نہ کیا۔ دوسری جانب ہمارے معاشرے کے سیاستدان اور اعلیٰ عہدوں پر فائز افسران اپنے ضمیر کا سودا اور ملک سے غداری کرتے وقت بالکل نہیں گھبراتے۔ ناول میں نواب ثریا اور امبر جان کے کردار ایسے ہی بے ضمیر لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ یاور حسین (عطائی) نے اپنی زندگی کے بلند ترین مقصد کو حاصل کر لیا۔ اس نے دنیا پر حکومت کرنے والے لوگوں کو اپنی Aphrodisiac ادویات کے ذریعے جھکا تھا ان لوگوں کی حیثیت اس کے سامنے اس وقت غلام سی ہوتی ہے جو اپنے آقا کی ہر بات کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے:

> "ایسی کوئی فتح مندی تو عطائی کی آنکھوں میں بھی تھی اور زرا سے کھینچے اس کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ کی لکیر بھی تھی۔ مگر وہ فتح مندی کسی ایسے شخص کی تھی جو کسی وحشی خونخوار کتے کو پالتو کر لیتا ہے اور اسے اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور دیکھ کر بس بے نیاز ہو جاتا ہے۔"(۱۶)

مانگر جاتی سے تعلق رکھنے والے اس آدمی کی یہ ایک انتہائی بلند ترین کامیابی نصیب ہوئی جس کا اقرار امبر جان

سمگلر و جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ نے بھی کیا۔ وہ اس کا نام سنتے ہی خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ وہی امبر جان عطائی کے پیروں میں بیٹھا ہے اس کی دوائی کا گرویدہ بھی ہے۔ سمگلر امبر جان اپنی خباثت سے لبریز آنکھیں لیے جن میں ہر وقت شیطانیت رقص کرتی محسوس ہوتی ہے، احسان مندی سے یاور عطائی کی طرف ستائش کے انداز میں دیکھتا اور دل میں سوچتا ہے کہ ایسا بندہ جس نے ہماری کمزوری کو قابو کر کے ہمیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ ہمیں بھی بادشاہ مانتا ہے اس کی نیت خراب ہے اور یاور عطائی یہ بھول گیا ہے جس کے بارے میں وہ سوچ رہا ہے کہ ایسا سفاک انسان جس نے شاید زندگی میں کوئی اچھا کام نہ ہو کیا وہ عطائی کے احسان کا رویہ اس کو اچھائی سے دے گا۔ نہیں کبھی نہیں کیوں کہ امبر جان زہرہ کے لیے پاگل ہے اور وہ ہر قیمت پر اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے مگر زہرہ کی بے اعتنائی اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہے۔

زہرہ اور کبیر انعام گڑھ میں بھورے بادشاہ سے ملتے ہیں لوگ اسے جادوگر کہتے ہیں۔ مندری اس قوم کا سب سے زیادہ عقلمند شخص تھا۔ وہی کبیر اور زہرہ کو انعام گڑھ کی تباہی و بربادی کی حالت زار بیان کرتا ہے بستی کے لوگوں، کاچھروں اور پگلوں کے ظلم و ستم سہے قحط کا سامنا کیا اور ارذل نسلیں مانگر جاتی جن سے جینے کا حق بھی چھین لیا گیا۔ کتے، بلیلاں، چھپکیلاں غرض ہر چیز کھا جانے والی قوم ہیں مگر کیا ان کی یہ سزا بنتی ہے کہ اصلاح کے بجائے ان کی نسلوں کو تباہ کر دیا جائے۔ مرزا اطہر بیگ نے معاشرے کے حقائق بیان کرتے ہوئے دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی کو بھی اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے، عالمی سطح پر مشرق کے حوالے سے یہی نظریات شرق شناسی کا فرق بھی واضح کرتے ہیں:

> "کسی کے بارے میں کہ وہ اہل شرق یا مشرق کا باسی ہے، جیسا کہ شرق شناس کہتے تھے، محض اس لیے نہیں تھا کہ یہ نام اس آدمی کو دیا جائے، جس کی زبان، جغرافیہ اور تاریخ میں وہ مواد ہے، جس پر علمی اور عالمانہ مقالات سپرد قلم کیے جائیں۔ یہ نام دینا اکثر تحقیر آمیز بات تھی۔"(۱۷)

ناول غلام باغ میں مرزا اطہر بیگ نے تکنیک کے تجربات بھی کیے ہیں یہ ناول مابعد نو آبادیاتی طرز پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس لیے روایتی انداز سے مختلف ہے۔ مابعد جدید فکشن میں سیاہ مزاح کی تکنیک کو Black humor irony اور playfuln irony کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تکنیک اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب غیر معمولی مسائل کا سامنا ہوا اور ان کے حل کے لیے کسی موثر طریقہ کار کی تلاش ہو۔ سیاہ مزاج کی تکنیک میں موت، تشدد کی ہر قسم خواہ وہ جنسی ہو یا جسمانی، ہیجانی، تشویش، قتل معاشرے میں پھیلے انتشار کے باعث بد عنوانی منشیات کا استعمال اور ڈپریشن وغیرہ۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> "واقعات بعض مخصوص معاملات میں معروضی نوعیت رکھتے ہیں جب یہ کیا جاتا ہے کہ

کوئی شئے مخصوص صفت یا اضافت کی حامل ہے تو گویا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے لیکن وہ شئے بذات خود واقعہ نہیں۔"(۱۸)

مرزا اطہر بیگ نے موت کی اٹل حقیقت پر مبنی واقعات کو بھی پیش کیا ہے مثلاً موت خادم حسین، ننگے افلاطون کی موت، بھورے بادشاہ، یاور عطائی کی موت اور سب سے زیادہ افسوس ناک موت جرمن آرکیالوجسٹ ہاف مین کی ہے جو کہ ایک غیر متوقع موت ہے انھوں نے اس کی موت کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ اس کے مرنے کے آخری لمحات کی نفسیاتی کشمکش کو بھی نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ میٹا فکشن ادب کی ایسی تکنیک ہے جس میں قاری کو اس بات پر اکسایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے دفاع میں اس خیال کو رکھے کہ وہ حقیقت نہیں بلکہ افسانوی ادب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ میٹا فکشن کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ قاری کو فکشن کی تکنیک سے متعارف کرواتی ہے کہ فکشن میں کون سی تکنیکس کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانی کو لکھا گیا ہے۔

تاریخی بیانیے کی اصطلاح عموماً ان افسانوی متون کے لیے برتی جاتی ہے جس میں مہا فکشن کے ساتھ تاریخی بیانیہ کو بھی لایا جاتا ہے کیوں کہ یہ متون اپنے اندر تاریخی حوالہ جات رکھتے ہیں۔ متون کے پڑھنے سے قاری متاثر ہوتا ہے۔ تاریخی حقائق کو جاننے کی کوشش ناول غلام باغ میں مرزا اطہر بیگ نے کئی تاریخی اصطلاحات کو کافی جگہ برتا ہے۔ ارذل نسلوں کی اساطیر اور چندر گپت موریا کے دور کے جنم کھنڈر اور غلام باغ بھی جو کہ نوآبادیاتی دور میں ایک ایسا باغ تھا جہاں پر ایسے قیدی لائے جاتے تھے جو کہ حکومت سے بغاوت کرتے تھے اور اس باغ میں انھیں قید میں رکھ کر ان پر تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ ناول میں ایک پر اسرار فضا ہر وقت چھائی رہتی ہے۔

ارذل نسلیں معاشرے کے دھتکارے ہوئے وہ لوگ ہیں جو نوآبادیاتی دور میں رذیل بنا دئے گئے۔ یہ پکھی واس، مانگر جاتی، کم ذات یا کمی کمین لوگ یا وہ لوگ ہیں جو نچلے غریب ترین طبقے سے تعلق قائم رکھتے ہیں۔ ان میں چند ایک باشعور لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اصل کی شناخت قائم کر سکیں۔ یہ لوگ اپنی محنت، لگن سے رزق حلال کے ذریعے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور خود کو عزت دار و باوقار بنانے میں مصرف ہوتے ہیں مگر ان کی ساری جدوجہد امرا کے ہاتھوں مٹی میں مل جاتی ہے اور ناول "غلام باغ" ارذل نسلوں کی کہانی ہے۔

حوالہ جات

۱:E.M.Faster, Aspect of the Novel, Printodin, great britain, ۱۹۲۷, p:۱۹

۲۔ ڈی ایچ لارنس، ناصر عباس نئیر، ڈاکٹر، اردو کا افسانوی ادب، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۲ء، ص:۲۱۳

۳۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، فلیپ

۴۔ عامر سہیل، محمد، نوآبادیات و مابعد نوآبادیات، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص:۳۴

۵۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص:۴۳
۶۔ ایضاً، ص:۸۸۔۸۹
۷۔ محمد یسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، کراچی: فضلی بک سپر مارکیٹ، ۲۰۱۳ء، ص:۹۲
۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص:۳۰
۹۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، ص:۴۰
۱۰۔ ایضاً، ص:۴۱۲
۱۱۔ ایضاً، ص:۴۱۸
۱۲۔ ایضاً، ص:۶۳۷۔۶۳۸
۱۳۔ ایضاً، ص:۴۲
۱۴۔ ایضاً، ص:۶۵۱
۱۵۔ ایضاً، ص:۲۹
۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۰
۱۷۔ ایڈورڈ سعید (مترجم: محمد عباس)، شرق شناسی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء ص:۳۸۳
۱۸۔ قاضی جاوید، جدید مغربی فلسفہ، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء، ص:۵۴